ڈکشنری کے نیچے دبا دیا گیا۔لیکن پھر تم نے بھرپور نگاہوں سے مجھے نہیں دیکھا۔ایسے ہی جگنو سے جھپکاتی رہیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔بعض اوقات تمہاری رہبری بھی چوکڑیاں بھول جاتی تھی۔

اکثر ایسے بھی ہوا کہ تم نے اپنی پسند پر میری مرضی کو قربان کر دیا اور میں نے پتہ نہیں کیوں قربان ہونے دیا۔میں بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالتا تھا۔لیکن تم نے کہا ''مجھے درمیان میں پسند ہے'' میں نے کنگھی تمھارے آگے بڑھا دی تو تم نے کہا۔''میں خود نہیں نکالوں گی۔'' پھر میری مانگ خود بخود سیدھی نکلنے لگی۔پر ان بالوں کو حسرت ہی رہی کہ کبھی تمھارے ہاتھوں سے منت پذیر شانہ ہوتے۔

ایک بار جب میں کرائے کی نئی سائیکل لے کر سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا اور شام کو دکان بند ہوگئی تھی اور میں سائیکل لے کر گھر آ گیا تھا تو رات کو کھلی ہوئی چاندنی دیکھ کر تمھارا جی چرایا۔تم سائیکل برآمدے سے باہر گلی میں نکال کر لے گئیں۔لیکن چلاتا کون! اس وقت اگر میں نہ ہوتا تو پتہ نہیں تم کتنی دیر ایسے ہی کھڑی رہتیں۔پھر میں نے ہی تمہیں آگے بٹھا کر گلی کے اس سرے تک سیر کروائی۔لیکن اونچے نیچے گڑھوں والی زمین پر سائیکل اچھلتی رہی اور میری ٹھوڑی تمھارے سر سے ٹکراتی رہی اور واپسی پر جب میں نے یہ رائے دی کہ دکانوں کی قطار کا چکر کاٹ کر اپنے گھر کے پچھواڑے جا اتریں گے کیونکہ وہ راستہ ہموار تھا تو تم نے میری تجویز رد کر دی تھی۔اگر اس طرح ایک بار پھر میری ٹھوڑی تمھاری مانگ کو چھوتی رہی تھی تو میرا کیا قصور؟

جب تم کالج سے دوپہر کو گھر آتی تھیں تو میں اپنی کھڑکی کھولے ہوئے بیٹھا ہوتا۔ہمارے گھر کے عین سامنے ایک چھوٹی سی کھائی تھی۔جسے تم ہمیشہ ھلانگ کر گذرا کرتی تھیں۔تمہارے ساتھ اور دو تین لڑکیاں بھی ہوتیں مگر وہ کبھی اس طرح نہ گزری تھیں۔یا تو اس سے کترا جاتیں یا ایک پاؤں اس میں اتار کر دوسرا اگلے کنارے پر رکھ دیتیں۔میں یہی نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی کے پٹ کھولے رکھتا تھا۔تھوڑے عرصے بعد وہ کھائی پر ہوگئی۔لیکن تم نے اپنا انداز نہ بدلا۔تم اس تازہ ڈھلی ہوئی مٹی پر سے اسے طرح گزرتی رہیں جیسے کھائی سے گزرتی تھیں اور وہ نشیب پر ہونے کے باوجود میری کھڑکی بند نہ ہوئی۔جب میں نے خدا کو ماننا چھوڑ دیا تو اوروں کے ساتھ تمہیں بھی رنج ہوا۔بھائی جان سے میری لمبی لمبی بحثیں سن کر تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔''آخر آپ خدا کو مانتے کیوں نہیں؟''

تو میں نے کہا تھا کہ ''اس کے ماننے یا نہ ماننے سے انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔'' تو تم نے جواب دیا تھا کہ ''میں تو سمجھتی تھی فلسفہ سے تمہارا دماغ روشن ہو جائے گا۔پر۔۔۔۔''

روشن ہی تو ہوا ہے۔'' میں نے کہا تھا۔''جب وقت۔۔۔۔''

''وقت اور فاصلہ میں کچھ نہیں سمجھتی۔'' تم نے بات کاٹ کر کہا۔''آج سے خدا کو مانا کرو۔''

''لیکن۔۔۔۔؟''

''لیکن کچھ نہیں۔میں جو کہتی ہوں کہ خدا ہے۔''

''پر۔۔۔۔۔۔۔''

''اچھا تو جا کر اپنی کھڑکی بند کر لو۔سمجھ لو کہ آج سے وہ کھائی پر ہو چکی۔''

''میں تم سے تو شاید نہ ڈرتا۔لیکن تمہاری دھمکی سے ڈر گیا۔'' اور اس دن مجھے ہر شے میں خدا کا ظہور نظر آنے لگا۔

کل رات پیٹر میرے پاس آیا تھا اور دیر تک بیٹھا رہا تھا مگر آج نہیں آیا۔میں نے کہا نا کہ وہ بڑا جذباتی ہے۔البم دے گیا ہے۔جسے اب تک میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔اب بھی وہ میرے سامنے کھلا پڑا ہے۔تین بجے شب طیاروں نے ٹیک آف کیا۔ہم اس وقت مزے سے سو رہے تھے۔صبح صبح میں کنٹرول گیا۔لیکن وہاں حد درجہ کی مصروفیت تھی۔چند منٹ تک پیٹر کے پیغام کا انتظار کرنے کے بعد میں اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔دوپہر کو ہمیں ونگ کمانڈر نے بلایا۔دیر تک نقشہ پھیلائے ہم ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے رہے پھر ایک خاکہ مرتب ہوا اور ہمیں پوزیشن سمجھا دی گئی۔میں پھر آ کر پیٹر کا البم دیکھنے لگا جس کے اخیر میں مارگیرٹ کی ایک تصویر تھی۔جہاں وہ پیٹر کی پی کیپ پہنے ہوئے ہنس رہی ہے۔آٹھ طیارے واپس آ گئے مگر پیٹر نہیں آیا۔کنٹرول نے پیام دیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ہم سب عرشہ جہاز پر نکل آئے اور آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کرنے لگے۔تشویش بڑھتی گئی۔ونگ کمانڈر مایوس ہو گیا۔لیکن ہم لوٹ کر اپنے کیبنوں میں نہیں گئے۔سمندر متلاطم ہو گیا تھا۔دور تک نیلا نیلا پانی بالکل سیاہ ہو گیا اور جہاز ڈولنے لگا۔بڑی بڑی لہریں اٹھتیں اور جہاز سے سر مارنے لگتیں۔بہت سی اونچی اونچی لہریں عرشہ جہاز پر آ کر پھیلنے لگیں۔ہمارے بوٹ پانی میں ڈوب ڈوب جاتے اور پتلونوں کے پائنچے ٹخنوں سے لپٹ جاتے۔لیکن سب کی نگاہیں آسمان میں گڑی ہوئی تھیں۔پھر اچانک سیاہ بادل امڈا اور تیزی سے ہماری طرف پھلنے لگا۔ہمارا طیارہ آ رہا تھا۔اپنے پیچھے دھویں کا ایک دبیز بگولا چھوڑے اس کا یک پر جل رہا تھا۔اور اس میں سے لمبے لمبے شعلے نکل رہے تھے۔سب ایک طرف ہو گئے اور طیارہ گویا عرشہ پر آ کر گر پڑا۔ہم نے ربڑ کے نلوں سے اس پر پانی کی بوچھاڑ کر دی اور پھر اس کی ادھ جلی چتا پر پل پڑے۔میں نے کاک پٹ کھول کر جب پیٹر کو باہر نکالا تو اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔سٹریچر منگوایا اور اسے لے گئے۔تو پچی کا پتہ نہ تھا۔پیٹر نے اپنے ناتواں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے کر کہا۔''ذرا میرا البم تو لاؤ۔'' ہارلو میرے پاس کھڑا تھا۔میں نے اسے کہا اور جب وہ لے آیا تو پیٹر نے کہا۔'' آخری تصویر نکالو''۔میں نے مارگیرٹ کی وہی تصویر نکالی۔پیٹر نے اسے اپنی دھندلی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔''اسے میرے قریب تو کر دو۔'' جب میں نے اسے قریب کر دیا تو بولا۔''ذرا اور نزدیک۔'' اس کے بعد اس نے کہا۔'' مارگیرٹ نے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔دیکھو میری ٹوپی پہن کر کس قدر خوش نظر آتی ہے۔اسے ہوائی فوج سے بہت انس تھا۔اس کی تمنا تھی کہ میں ایک اچھا پائلٹ بن سکوں۔میں پائلٹ تو بن گیا مگر شاید اچھا نہیں! یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر پرنسٹن کی گلیوں چلا کرو گے۔تو ہر بری اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کرے گا۔کاش اس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی''۔

شام کو ہم سب نے پیٹر کو اس کے جلے ہوئے جہاز میں ڈال دیا اور ٹوپیاں اتار کر اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔امریکنوں نے نہایت دردناک مگر اونچے سروں میں وہی مشہور گیت گانا شروع کر دیا۔'' آج تمام روئے زمین امریکہ کے پروں کے نیچے ہے۔''

پھر اس کے جہاز کو آہستہ آہستہ دھکیل کر ہم نے سمندر میں پھینک دیا۔ایک بڑا سا بھنور پیدا ہوا اور پھر طیارے کی جلی ہوئی دم اس

میں غرق ہوگئی۔ونگ کمانڈر نے کہا۔''ایک اچھے ہواباز کو کتنا اچھا تابوت ملا!''۔۔۔آج صبح میرا ٹیک آف ہے۔اور ہم اسی عرشہ سے اڑیں گے جہاں کل رات ایک اچھا ہواباز اڑا تھا۔لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ہارلو بہت اچھا نشانچی ہے۔اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا!

میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔۔۔میں تو ابھی تک فیصلہ بھی نہیں کر سکا کہ خط لکھوں بھی تو کسے لکھوں!

تلاش

ویسے تو یہ دانے پانی کے اختیار کی بات ہے لیکن اگر خان کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو جیکی ہندوستان میں ہی رہ جاتا۔ اس بھگدڑ میں لوگ مال و اسباب تو کیا خویش و اقارب تک کو بھول گئے۔ بھلا ٹھائیں ٹھائیں دغتی بندوقوں میں بیچارے احسان کی طوطی ایسی آواز کہاں پہنچتی جو کسی فوجی کی توجہ سے الجھ کر احسان کی بہتی ہوئی آنکھیں اور ناک دکھا سکتی۔

جب خان نے کیپٹن حق نواز سے ہاتھ باندھ کر کہا کہ یہ اس چھوٹے سے پلّے کے لیے جان دے دے گا مگر اسے اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا تو کیپٹن صاحب نے اسے جھٹلانے کے لیے طنزیہ مسکرا کر کہا۔ ''ابھی ٹیسٹ کیے لیتے ہیں۔'' پھر انہوں نے ٹرک کا انجن چلا کر پورے زور سے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ایک ہلڑ مچا اور کندھوں پر چھڑے ہوئے والدین اور اولادیں ٹپکے کے آموں کی طرح زمین پر آ رہیں اور انہیں اٹھانے والا ٹرک کی طرف ایسے لپکے گویا کسی نے آدمیوں کی باڑھ ماری ہو۔ احسان کا چہرہ ایک دم ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور وہ بھی اس طرف بھاگا۔ لیکن اس نے جیکی کو بغل سے گرایا نہیں۔ کیپٹن پیار سے ہنسا۔ انجن بند ہو گیا اور سب پھر اپنے اپنے آم چننے لگے۔ احسان کے گال اوپر کو ہلے اور ان بھیگے ہوئے پھولوں سے جیسے دو شہابی تتلیاں آ کر چپک گئیں۔ کیپٹن نے ٹرک سے اتر کر اسے جیکی سمیت گود میں اٹھا لیا۔ فوجیوں کے ذہن پر جب رحم و کرم کے بادل چھاتے ہیں تو نوازش ہائے بے جا کی بارش چھاجوں برسنے لگتی ہے!

اپنے بیٹے کی یہ عزت دیکھ کر اس کے ابا آگے بڑھے اور بولے۔ ''یہ آپ نے کیا کیا کہ اسے گود میں اٹھا لیا۔ ہمیشہ ڈرٹی رہتا ہے۔ کتوں سے کھیلتا ہے اور۔۔۔۔ اور۔'' پھر احسان سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اترو بیٹا، انکل کی وردی خراب ہو جائے گی۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''یہ ہمارا دوست ہے۔۔۔۔۔۔ دوست ہو نا؟''

احسان نے کوئی جواب نا دیا اس کے ابا نے کہا۔ ''اگر مستورات ابھی سے ٹرک میں بیٹھ جائیں۔۔۔۔۔۔''

''ضرور ضرور۔'' کیپٹن نے احسان کو ٹرک میں اتارتے ہوئے کہا اور کہا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہیوں کو ان کا سامان لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب کانوائے تیار ہو گیا تو کیپٹن بجائے آگے بیٹھنے کہ پیچھے چلا آیا اور احسان کو ٹرنک سے اٹھا کر اس کے ابا جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

دُور دور تک آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی اور اس کے پیچھے مرنے مارنے والوں کا شور و غل ایسے لگتا تھا جیسے آسمانوں پر کا جہنم مکمل ہو چکا ہو اور اب زمین پر اس کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہو۔ احسان پلّے کو چھاتی سے لگائے کھڑا تھا۔ اس کی بہنیں کانپ رہیں تھیں اور اس کے ابا ٹوپی گود میں دھرے وہ تمام سورتیں دہرانے کی کوشش کر رہے تھے جو انہیں بچپن میں یاد کرائی گئیں تھیں۔ گڈی بغیر آواز کے روئے جا رہی تھی اور ٹینم اپنے بوٹ ہاتھوں میں پکڑے امّی کی گود میں چھپی ہوئی تھی۔ خان ابّا کے پاؤں میں بیٹھا ایک دیہاتی سے کلمہ پڑھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

جب ٹرک چلا اور احسان نے بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو کیپٹن نے کہا۔ ''آپ بیٹھ نہیں سکتے۔ آپ کو پلّا لے جانے کا جرمانہ

ادا کرنا ہوگا۔'' احسان کو یہ جرمانہ بہت پسند آیا۔اس نے خوش ہو کر خان کی طرف دیکھا اور پھر جیکی کے نتھنوں میں پھونکیں مارنے لگا۔

''اس میں کیا وصف ہے؟'' کیپٹن نے پلّے کو چھو کر پوچھا۔

''جی یہ جیکی ہے۔''

''جیکی تو ہے پر اس کی صفت کیا ہے؟''

''جی یہ بھونکتا ہے۔''

''سبھی کتے بھونکتے ہیں۔۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں تم نے اس کے بجائے کوئی اور کتا کیوں نہ پال لیا؟''

''یہ دیکھیے۔'' احسان نے آگے بڑھ کر کہا۔''اس کے بیس ناخن ہیں۔دوسرے کتوں کے صرف اٹھارہ ہوتے ہیں۔پانچ پانچ آگے اور چار پیچھے۔وہ اتنے طاقت ور نہیں ہوتے۔جیکی بہت طاقت ور ہے۔اس کا سر دیکھیے۔نور دین کہتا تھا جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ریچھ کا شکار کرے گا۔بیس ناخنوں والے کتے اپنے پنجے ریچھ کی آنکھوں میں گاڑھ کر اس کی تھوتھنی چبا جاتے ہیں۔''

باجی ہنسی تو اس کی امّی نے کہا۔''مجھے اس کی یہی باتیں زہر لگتی ہیں۔صدقے کروں اس جیکی کو، یہ کم بخت تو اس کے لیے سڑی ہو گیا ہے۔''

جب اڑمڑ ٹانڈہ قریب آ گیا تو احسان ذرا جھکا لیکن اس نے جیکی کو یوں ہی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔اسے کیپٹن صاحب کی طرف بڑھا کر بولا۔''ذرا اسے پکڑیے۔''

''کیوں؟''

''مجھے پاؤں کھجانا ہے۔بڑے زور کی کھجلی ہو رہی ہے۔''

کیپٹن صاحب نے پی کیپ اپنی گود سے اٹھا کر احسان کے سر پر ڈال دی اور جیکی کو اپنی گود میں بیٹھا لیا۔جب وہ پاؤں کھجا کر اٹھا تو ٹینم ننھے سے کپتان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ہاتھ میں پکڑے ہوئے بوٹ پھینک کر بولی۔''سانوں بھائی،تم نے یہ ٹوپ کہاں سے لیا؟'' مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا کیوں کہ یہ وضع داری کے منافی تھا۔پھر حق نواز نے جیکی کو لوٹا کر اس کے مالک کو اپنی گود میں بیٹھا لیا۔

راستہ میں احسان نے اسے بتایا کہ اس کے ابا جان دلّی میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور ان دنوں وہ باجی اور آپی کی شادی کرنے میانی آئے ہوئے تھے جو فسادات کی وجہ سے رک گئی۔ان دونوں کے منگیتروں میں سے وہ آپی کے منگیتر کو زیادہ پسند کرتا تھا۔کیوں کہ ایک دفعہ انھوں نے جیکی کو گود میں اٹھا لیا تھا اور ویسے بھی وہ ہر کتّے سے پیار کرتے تھے۔اس کے علاوہ نسیم بھائی یوں تو اس کے ماموں زاد بھائی تھے پر اسے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز تھے کیوں کہ وہ جب دفتر سے لوٹتے جیکی کو تالی پیٹ کر اور سیٹی بجا کر پاس بلاتے اکثر اوقات وہ پوری پوری ٹافی جیکی کے آگے ڈال دیا کرتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک دفعہ انھوں نے اپنی عینک جیکی کو منہ دبائے دیکھ کر صرف رومال کا ایک گولا مارا تھا۔بھلا یہ بھی کوئی سزا تھی۔احسان کا دل چاہا کہ کاش نسیم بھائی اس دن ٹرک میں ہوتے تا کہ وہ انھیں کیپٹن صاحب سے ملا سکتا اور جب امّی جان کا ذکر آیا تو احسان نے گفتگو ذرا آہستہ کر دی کیوں کہ ان کا روّیہ جیکی کے متعلق کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔

امّی کی طبعیت میں ایک عجیب قسم کا تلوّن تھا۔ کبھی تو جیکی کو وہ خود راتب ڈالتیں اور کبھی مارے ٹھوکروں کے بے حال کر دیتیں۔ ہر وہ گالی جو اس کو دی جاتی احسان کے دل میں تیر کی طرح اترتی اور پتے ہوئے لوئے کی طرح پھول کر جیسے پانی میں ڈوب جاتی۔ اس وقت اس کا بس چلتا تو ایک چھوٹا سا گھر لے کر الگ ہو جاتا جس میں وہ اور اس کا محبوب کتّا مزے کی زندگی گذارتے۔ باجی اور آپی جیکی کو اتنا اچھا نہ جانتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس کی برائی میں امّی کا ساتھ دیتیں لیکن اس کے اوصاف گنوانے میں انھوں نے کبھی زبان نہ کھولی تھی۔ منی آپا جیکی کو اس قدر برا نہ سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے اور چیزیں گھر میں یونہی پڑی رہتی ہیں ایک یہ بھی سہی۔ ناک میں انگلی پھیرتے ہوئے کبھی کبھار وہ جیکی کے پاس سے گذرتیں تو اپنے ننگے پاؤں سے اس کی پوستین سہلانے لگتیں اور وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر اپنی چاروں ٹانگیں اوپر اٹھا لیتا۔ دراصل انھیں اس کے کتّے سے محبت جتانے میں بڑا مزا آتا۔

کراچی پہنچ کر خان اکثر احسان سے پاسنگ شو کی سگرٹیں منگوایا کرتا اور اگر کبھی احسان موڈ میں ہوتا تو وہ پیسے نکالنے سے پہلے تمہید باندھنی شروع کر دیتا۔ ''دیکھو یار اگر ہم نہ ہوتے تو تیرا جیکی ہندوستان ہی رہ جاتا۔ رہ جاتا کہ نہیں؟ اور پھر کہاں میانی اور کہاں کراچی ؟ وہاں تو ایسے ایسے آدمی رہ گئے جنھیں یاد کر کر آج کئی گھر راتیں رو رو کے گذارتے ہیں۔۔۔۔۔ میں تو مر جاتا پر تیرے جیکی کو ادھر نہیں چھوڑتا تھا۔'' خان کو اس پلّے سے نہ نفرت تھی نہ ہی لگاؤ۔ وہ تو صرف اپنے فن سے محبت کرتا تھا۔ باتیں بنانے کا اسے ایک خاص سلیقہ تھا۔ ایسا سلیقہ جس سے بڑے بڑے سنگ دل منٹوں میں پسیج جائیں۔ جیکی کو سوار کرانے کے لیے اس نے جو کچھ کیا سرف اپنی تسکین اور فن کے مظاہرے کے لیے۔ عملی قدم احسان نے اٹھایا۔

جس دن لمبے لمبے کرتے والی دوسندھنیں کوارٹر کے سامنے سے گذرتے ہوئے برآمدے میں آ کر ٹینم کا فراک کھسکا کر لے جانے لگیں تو جیکی جاگ اٹھا۔ اپنی لچکیلی ہڈیوں میں ننھے ننھے پھیپھڑوں کو پورے زور سے پھلا کر اس نے دو دفعہ بخ بخ کی اور پھر دم ٹانگوں میں دبا کر لرزنے لگا۔ امّی نے آواز سن کر باہر نکلیں۔ اس دوران میں وہ فراک وہیں چھوڑ کر بھاگ چکی تھیں۔ امّی نے جیکی کا یہ کارنامہ سب کو سنایا ۔ احسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جیکی کو گود میں اٹھا کر ایک بار تو بس چوم لے۔

امّی نے کہا۔ ''کتّا تو چہرے میرے سے جھٹ پہچانا جاتا ہے۔ یہ نسل ریوڑوں کی رکھوالی کرتی ہے۔ کیا مجال جو موئے دم بھر کو سو جائیں۔ ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ گڈریا اپنی بیٹی کا ڈولا دے دیتا ہے پر کتا نہیں دیتا۔ یہ کم بخت تو ہے ہی ہڈیوں کا مٹھا۔ ذرا ٹھیک سے خوراک ملے تو دنوں میں شیر کا جھبرا ہو جائے۔ پر ہمارے یہاں پابندی کہاں۔ میاں صاحبزادے سارا دن خاک اڑاتے ہشت ہڈو کرتے پھرتے ہیں۔ مجال ہے جو اس کے تسلے میں جھانک کے بھی دیکھیں۔ پچھلے دنوں اچھا خاصا بیمار رہا۔ میں جنم جلی اس جوگی کہاں کہ اس کی خبر بھی رکھوں۔ خود ہی لوٹ پوٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔''

احسان نے کہا۔ ''امّی میں تو۔۔۔''

''بس اب رہنے دے۔'' امّی تنک کر بولیں۔ ''میں تم سب کے لچھنوں سے واقف ہوں۔ یہاں سب ہی باون گزکے ہیں۔ میں کس کس کو پیٹوں؟''

احسان خاموش ہو گیا۔ واقعی وہ اس کی خوراک کے متعلق محتاط نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ چلو آج اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ منی آپا کی بائیں آنکھ پر گومڑی چند دن ہوئے نمودار ہوئی تھی۔ اب سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور امّی انھیں ڈاکٹر کے یہاں لے کر گئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں جیکی کو مکھن لگے نوالے کھلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ پر ڈاکٹر بھی پتہ نہیں کتنا بے حس آدمی نکلا کہ بغیر نشتر زنی کے مرہم لگا کر لوٹا دیا۔ احسان ابھی تک گلی میں کھڑا اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کی امّی جان واپس آ گئیں اور جیکی کی ضیافت منسوخ ہو گئی۔

مگر جس دن بڑی اماں کا چالیسواں تھا۔ اس دن سب کی شامت آئی۔ امّی نہا رہی تھیں اور باقی سب بڑے کمرے میں مزے سے لیٹے تھے۔ جیکی کو پتہ نہیں کہاں سے آزادی نصیب ہوئی کی پہلے تو رات کی باسی ہنڈیا میں ننھے ننھے پنجوں سے قیمہ کھرچ کھرچ کر چاٹا۔ پھر دودھ کی ناند میں تھوتھنی ڈبو کر منہ کے راستے پیتا رہا اور بلبلے سے بناتا رہا۔ امّی باہر نکلیں تو گویا قیامت آ گئی۔ جیکی تو خیر دو تین چیخیں مار کر کوئلوں کی بوریوں کے پیچھے جا چھپا۔ لیکن دوسرے سب کہاں چھپتے! وہ منہ بھر کے گالیاں دیں کہ سب اپنی اپنی جگہ بت بن گئے۔ ''کہاں گیا احسان کا بچہ؟'' انھوں نے کڑک کر پوچھا۔ ''منہ جھلس دوں تیرا، پاجی بڑی سوغات اٹھا کے لایا تھا۔ اپنی اور کوئی چیز تو لا نہ سکے یہ طباقی اٹھا لایا۔ قربان کروں ایسے بچوں کو۔ جھاڑو پھرے موئے کی صورت پر، شکل نہ عقل، کیا مجال جو کبھی آنکھ بھی کھولی ہو۔ جب دیکھو موا پڑا ہے۔۔۔ اور یہ سب اسی حرام زادے خان کی کرتوت ہے۔ بڑھ بڑھ کے باتیں بناتا تھا۔ پتہ نہیں کیا حرام حلال کھاتے ہیں سارا دن۔۔۔ میں پوچھتی ہوں حرام ہی کھانا تھا تو موئے فرنگیوں سے حکومت ہی کیوں لے لی تھی۔۔۔ آج یہاں یا تو جیکی رہا یا میں۔'' پھر وہ تیز تیز سانس لیتی ہوئی بولیں۔ ''بھرا بھرایا دیگچہ، کوئی آٹھ سیر پختہ دودھ۔ غضب خدا کا سب کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا۔ دیکھو کس مزے سے لیٹے ہیں۔ جیسے دودھ نہیں نالی کا پانی پیا ہو اور سن خان، یا تو پھینک آ اس کو سمندر میں۔ نہیں تو باندھ اپنا بوریا بستر۔''

خان ہنسنے لگا۔ اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''امّی جہاں مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، یوں سمجھو میں اکیلا آپ کے گھر میں نہیں آیا۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی ہے۔'' سب ہنسنے لگے اور امّی کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔ لیکن شام کو جیکی کے خلاف تادیبی کارروائی عمل میں لائی گئی کہ اسے رات کا راشن نہ ملا اور وہ بھوک سے بیتاب ہو کر تمام رات جاگتا رہا۔ گڈریوں کا کتا!

امتحان کے دن قریب تھے۔ منی آپا ڈھیروں ساری کتابیں اپنے آگے ڈالے ناک کرید کرید کر تاریخ یاد کیا کرتیں۔ انھیں نہ اب احسان سے انس رہا تھا نہ جیکی سے! جوں جوں امتحان قریب آتا جاتا ان کی بیگانگی بڑھتی جاتی۔ امّی صبح صبح اخبار پڑھنے بیٹھتیں تو دوپہر تک مشکل سے دوسرے صفحے تک پہنچ سکتیں۔ اس کے بعد ہوا کے جھونکے نیند کے بھبکے لاتے اور وہ قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹ جاتیں۔ باجی اور آپی اپنے جہیز کی کشیدہ کاری میں مصروف ہو جاتیں۔ کیوں کہ پہلی کاڑھی ہوئی چادریں اور غلاف میانی رہ گئے تھے۔ خان نوکری پر بحال ہو گیا تھا۔ صبح کے دس بجے جاتا اور رات کو نو دس بجے صاحب کے بنگلے سے واپس آتا۔ احسان کے سکول میں پڑھائی پہلے سے دو چند ہو گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں اتنا سارا وقت ضائع کر دینے کا تریاق انھوں نے یہی سوچا کہ کراچی میں تعلیم کے اوقات بڑھا دیے جائیں۔ وہ سورج چھپے گھر واپس آتا۔ اس دوران میں جیکی لاکھ چیختا چلاتا، اپنی زنجیر دانتوں سے کاٹتا، پنجوں سے زمین کھرچتا لیکن کچھ بن نہ

پڑتی۔اس کے گلے میں پڑا ہوا چمڑے کا پٹہ، زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔پہلے تو امّی ہر صبح یاد سے اسے کھلا چھوڑ دیا کرتی تھیں۔لیکن اب وہ نئے سرے سے گھر بسانے میں اس برہ طرح الجھ گئی تھیں۔کہ انھیں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔باقی لوگ جیکی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ایک احسان تھا جو ہر شام اسے گھمانے باہر لے جاتا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ متواتر دو دن تک ایک ہی جگہ بندھا رہا۔رضیہ روٹیوں کے ٹکڑے، باسی سالن اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اس کے تسلے میں جھاڑ کر چلی آتی رہی۔احسان کے سکول میں ڈرامے کی ریہرسل تھی۔وہ ابھی تک نہ لوٹا تھا۔اندھیرا بڑھتا گیا اور جیکی اپنے مالک کو یاد کر کے چیخنے لگا۔امّی کو جانے کیا رحم آیا۔جا کے زنجیر کھول دی۔وہ پہلے تو ان کے قدموں میں لوٹا پھر اندر گھس گیا۔جب امّی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ قالین کو بالکل خراب کر چکا تھا اور ان کے پان دان سے تھوتھنی لگائے بڑی تیزی سے سونگھ رہا تھا۔

''ہائے رے کم بخت، جھاڑو پھرے کمینے، گولی لگے، لیکے سارا قالین تباہ کر دیا۔'' اور پھر پٹاخ سے جوتی جیکی کے سر پر پڑی۔تارے ناچنے لگے اور وہ وہاں سے بھاگ کر اندر ٹرنکوں کے پیچھے جا چھپا۔امّی کا غصہ اور تیز ہو گیا اور احسان سے لے کر اس کے ابا جی تک کو ایک ہی سانس میں اتنے کوسنے ملے کہ سب کا منہ اتر گیا۔احسان گالیوں کا یہ طومار دیکھ کر سہما سہما اندر داخل ہوا تو امّی نے چھوٹتے ہی تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔وہ ٹھیرا سکول کا لڑکا۔ہر بار خالی دیتا رہا۔جب اس کی امّی عاجز آ گئیں تو کان سے پکڑ کر بولیں۔''اب فیصلہ کر، اسی گھر میں رہے گا یا کہیں اور جائے گا؟ سوچ لے جلدی۔اٹھا لے بستہ اور لے جا اپنے اس ہوتے سوتے کو بھی۔یا تو چھوڑ آ اسے یہاں سے بہت دُور یا پھر کوئی اور امّی ابّا تلاش کر لے۔ہمارے یہاں تیرے لیے کچھ نہیں۔'' احسان اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔وہ امّی کی اس چھڑھی ہوئی آندھی سے اچھی طرح واقف تھا۔لیکن جب خان اندر داخل ہوا اور اسے بھی ایسی ہے صلواتیں سننا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔آج شام اس کی ہیڈ کلرک سے جھڑپ ہو گئی تھی اور وہ کچھ کھا کے سو رہنے کی سوچ رہا تھا۔اور مرے پر سو درّے یہ کہ امّی نے آتے ہی لتّے لیے کہ برہم ہو گیا۔پھر پٹھان کا پوت، گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔سائیکل باہر نکال کر جیکی کو ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں جا دبوچا۔وہ چلایا تو اس کا گلہ دبا کر سمجھا دیا کہ خان ہے احسان نہیں۔

ذرا دیر تک تو سائیکل کے پھٹپھٹاتے مڈگارڈ کی آواز آتی رہی۔اور اس کے بعد معدوم ہو گئی۔منی آپا نے کتابوں سے نگاہ اٹھا کر پوچھا۔''امّی! سچ مچ پھینک آئے گا کیا؟'' تو امّی بھنا کر بولیں۔''کونسی سوغات تھی۔۔۔ایسا بھی کیا گڈریوں کا کتّا تھا۔۔۔''

''پر امّی۔۔۔''

''نہیں پھینک کے آتا۔وہ کوئی سر پھرا تھوڑی ہے۔یونہی گھوم گھام کے آ جائے گا اور دیکھ احسان کے بچے اگر تو نے اس کا خیال نہ رکھا تو سچ مچ پھنکوا دوں گی گندے نالے میں۔'' احسان خاموش بیٹھا تھا۔اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں سچ مچ خان پھینک ہی نہ آئے۔لیکن خان اتنا بیوقوف تھوڑی تھا۔ہندوستان سے اٹھا کر یہاں اس لیے تو نہ لایا تھا کہ کراچی پہنچ کر پھینک دے!

آدھ گھنٹہ بعد خان واپس آ گیا۔اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ غصہ سے لال انگارہ۔احسان نے اسے خالی ہاتھ اندر آتے دیکھ کر کہا۔

''سچ مُچ چھوڑ آئے، خان؟''

''سچ مُچ! مجھ سے یہ روز روز کی دانتا کل کل برداشت نہیں ہوتی۔ امّی کو ہر بات میں میرا ہی قُصور نظر آتا ہے۔ بھلا جیکی سے میرا کیا تعلق؟ یہی نا کہ اُسے فوجیوں کی منّت خوشامد کر کے ٹرک میں سوار کرا لیا تھا۔۔۔ ایک دفتر والے جینے نہیں دیتے۔ دوسرے گھر بھی عذاب بن گیا ہے۔۔۔ آخر۔۔ آخر۔۔'' پھر وہ خود ہی رک گیا۔

باجی نے کہا۔ ''شرم نہیں آتی۔ ایک کھاتے ہو، دوسرے غراتے ہو۔ پتہ ہے کب سے یہاں پڑے ہو؟''

''شرم کہاں؟'' آپی روکھی ہو کر بولیں۔ ''ہر روز دفتر سے جوتے کھا کر آتا ہے۔ اور یہاں سب پر رعب گانٹھتا ہے۔''

منی آپا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ''واقعی پھینک آئے، خان؟''

''ہاں''۔ خان نے قاتلانہ اعتراف کیا۔

احسان پہلے تو پھُسک پھُسک رویا۔ پھر اُونچے اُونچے چلّانے لگا۔ ''خان کا بچہ۔۔۔ اُلّو کا پٹھا۔۔۔ تیرا کیا لیتا تھا۔ میرا جیکی تھا نا۔ مجھے گالیاں ملی تھیں۔ آیا بڑا معتبر۔ ذرا سے بچے کو۔۔۔ ذرا سے جیکی کو۔۔ بتا بتا۔۔۔ کہاں پھینکا ہے؟۔۔۔ کہاں چھوڑا ہے میرا جیکی؟۔۔۔ مر جائے اللہ کرے خان کا بچہ۔۔۔ بول کہاں چھوڑا ہے؟ بول۔۔ میں ابھی تلاش کر کے لاؤں گا۔۔۔۔ بتا! بتا!۔۔۔ بتا بھی !''

''ہوتھی مارکیٹ۔'' خان نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

''ہوتھی مارکیٹ؟''

''ہاں''

''کہاں ہے ہوتھی مارکیٹ؟''

''لارنس روڈ کے سرے پر۔''

احسان قالین کے ایک کونے پر بیٹھ کر اپنی چپلی کا فیتہ باندھنے لگا۔ اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ہونٹ بلک رہے تھے۔ ہر سانس کئی جھٹکوں سے اندر داخل ہوتا۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اور وہ غم و غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ جب وہ چپلی پہن کر اُٹھ کھڑا ہوا تو امّی نے کہا۔ ''کہاں جائے گا اس وقت، دیوانی ماں کا خبطی بیٹا۔۔۔ جا سورہ! صبح خود ہی آ جائے گا پھر پھرا کر۔ یہ کتّے آپ ہی آ جایا کرتے ہیں۔۔۔ پگلا کہیں کا۔۔۔ جا سورہ!''

احسان یہ سن کر بڑی بناک آواز سے رونے لگا۔ سب دم بخود کھڑے تھے۔ خان پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدنے لگا۔ توقیر بھائی نے کہا۔ ''لاؤ ہم بھی چلتے ہیں اس کی تلاش میں۔'' کتنے اچھے ہیں توقیر بھائی۔ واقعی سارے خاندان میں ایک توقیر بھائی ہی تو ہیں۔ ورنہ دوسرے تو سارے ایسے ہیں گویا بلیک مارکیٹ سے خریدے ہوئے بھائی ہوں۔ احسان کی بے تابی کا تماشا کر کے وہ پتلون پہننے لگے اور خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''کہاں ہے ہوتی مارکیٹ؟''

''لارنس روڈ کے سرے پر!''

''لیکن وہ تو جونا مارکیٹ ہے۔''

''اس سے ذرا دور ے''۔

''اچھا! اچھا!'' انہوں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بھئی، احسان! دو منٹ ہی کا راستہ ہے۔''

لیکن راستہ دو منٹ کا نہ تھا۔

سائیکل کا مڈگارڈ پھر پھٹپھٹایا اور اس کی آواز دور ہوتی گئی۔

''بھائی جان، یہ خان بڑا ظالم ہے۔''

''سارے خان ایسے ہوتے ہیں!''

''لیکن، توقیر بھائی اسے ترس نہ آیا؟۔۔۔۔۔وہاں جا کر اس نے جیکی کو زمین پر چھوڑا ہوگا تو وہ اس کے پیچھے بھاگا تو ضرور ہوگا۔''

''ضرور!''

''اس کے بیس ناخن تھے، توقیر بھائی، اور اس کا سر اتنا بڑا تھا'' احسان نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''اب پتا نہیں بے چارہ کہاں ہوگا۔ بھائی جان اس نے آج تک ٹریم نہ دیکھی تھی۔ وہ میانی میں پیدا ہوا اور اب تک وہیں رہا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ٹریم کے نیچے نہ آ گیا ہو۔ یہاں کے ڈرائیور چلاتے بھی تو آندھی کی طرح ہیں۔۔۔۔جیکی ضرور اس کے نیچے آ گیا ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا ہوگا ۔۔۔۔لیکن توقیر بھائی! ہوتی مارکیٹ ہے کہاں؟ وہاں اور بھی بڑے بڑے کتّے ہوں گے۔ وہ اسے مار دیں گے۔ آوارہ کتّے پٹے والے کتّے کو مار دیا کرتے ہیں۔ مار دیتے ہیں نا؟ ان کی دشمنی ہوتی ہے نا؟۔۔۔۔پر یہ خان بڑا ظالم ہے۔ مزا تو جب تھا جیکی بڑا ہو جاتا پھر یہ اسے پھینک کے آتا''۔۔۔۔۔پھر اس نے پلٹ کر توقیر بھائی کو دیکھا جو مزے سے سگرٹ پی رہے تھے۔ بے چین ہو کر بولا۔ ''توقیر بھائی! آپ کسی سے پوچھتے تو ہیں نہیں۔۔۔۔ایسے گھومنے سے ہوتی مارکیٹ کا کیسے پتہ چلے گا؟''

پھر ایک دم وہ بائیں بریک دبا کر چلایا۔ ''ذرا ٹھریے! سنیے! وہ دیکھیے وہ بھونک رہا ہے۔ یہ اسی کی آواز ہے۔ آپ پہچانتے نہیں۔ جیکی! جیکی! پچ! پچ!'' احسان بے قرار ہو کر ٹانگیں مارنے لگا۔ ''ادھر موڑیے، بھائی جان۔ اس طرف! یہاں سے آواز آتی ہے۔ ہائے صاف جیکی بول رہا ہے۔ آپ پہچانتے نہیں اس کی آواز! آپ کو یہاں آئے! اتنے دن ہو گئے اور آپ ابھی تک جیکی کی آواز نہیں پہچان سکے۔ ذرا تیز چلایئے توقیر بھائی۔ دیکھیے! سنیے! بالکل جیکی بول رہا ہے۔ ہائے میرا جیکی۔۔۔جیکی جیکی!!'' آواز گلی کی دونوں دیواروں سے ٹکرائی اور کتا خاموش ہو گیا۔ ''دیکھا، توقیر بھائی۔'' احسان نے خوش ہو کر کہا۔ ''میری آواز پہچانتا ہے۔ جیکی ہے نا!''

لیکن جب توقیر بھائی نے سائیکل اس کے پاس لے جا کر روکی تو سفید رنگ کا ایک غلیظ سا پلا انہیں دیکھ کر غرّانے لگا۔ سائیکل سے اتر کر احسان نے کہا۔ ''بالکل ویسی آواز نکال رہا تھا'' اور مایوس ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گلی کے موڑ پر دودھ کا گرم گرم گلاس اٹھائے ایک

آدمی سے اس نے پوچھا۔ ”ہوتی مارکیٹ کہاں ہے؟“ تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ احسان پھر خاموش ہو کر چلنے لگا۔ تو قیر بھائی نے رائے دی کہ سائیکل پر سوار ہو کر چکر لگائے جائیں۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی۔ اور پلا کہیں دور نکل جائے گا۔ مگر اس نے سنا نہیں۔ ایسے ہی چلتا رہا۔ بہت سے کتّے ادھر اُدھر کھیل رہے تھے مگر ان میں جیکی نہیں تھا۔ کوئی بہت بڑا تھا کوئی بہت چھوٹا۔ جیکی کے جسم کا ایک بھی کتا نہ تھا۔ کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر ایک داڑھی والے آدمی سے اس نے پوچھا۔ ”ہوتھی مارکیٹ کہاں ہے؟؟“

”چو؟؟“

”میں ہوتھی مارکیٹ کا راستہ پوچھتا ہوں۔ ہمارا کتّا گم ہو گیا ہے۔ اس کا نام جیکی تھا۔ یہ میرے بھائی ہیں۔ ہم اپنے کتّے کو تلاش کر رہے ہیں۔ خان اسے ہوتھی مارکیٹ پھینک آیا ہے اور ہمیں مارکیٹ کا پتہ نہیں۔۔۔۔“

XX!oňòu‡æ çi çj‰... oâ] àãþ]/ 8ňÒ...^Ú oãiçaZZ

احسان پھر چلنے لگا تو تو قیر بھائی نے اس کا کندھا ہلا کر سائیکل پر بیٹھنے کو کہا اور جب وہ سوار ہو گئے تو وہ آدمی انھیں دیر تک دیکھتا رہا۔ لارنس روڈ سے حاجی کیمپ کو مڑتے ہوے احسان سائیکل سے ایک دم پھسل پڑا اور چلایا۔ ”وہ رہا سامنے۔ تو قیر بھائی، وہ!“ اور واقعی جیکی سامنے کھڑا تھا۔ بھورا رنگ۔ دبلا جسم اور پتلی موقلم سی دم! سائیکل کو اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ خوف سے ایک طرف بھاگا۔ احسان چلایا۔ ”جیکی! جیکی!!“ مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی اور جب وہ بجلی کے ایک بلب کی روشنی تلے سے گزرا تو احسان رک گیا۔ وہ جیکی نہیں تھا۔ سیاہ بالوں والا کوئی آوارہ پلا تھا اس کے گلے میں کوئی پٹہ نہ تھا اور اس کی چال وحشت ناک تھی۔ دیوار سے اپلے اتارتی ہوئی ایک عورت سے اس نے پوچھا۔ ”مائی، ہوتھی مارکیٹ کدھر ہے؟“ تو وہ نہایت نرم لہجے میں بولی۔ ”پتہ نہیں بیرا اس تاں پنائی آں۔“ وہ پھر اپلے اتارنے لگی۔ احسان مایوس ہو کر رک گیا۔ خان بہت برا آدمی ہے، اس نے سوچا۔ اسے ایسی جگہ لے جا کر پھینکا جس کا کسی کو علم ہی نہیں پھر وہ ہر راہگیر کو روک کر پوچھتا رہا مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا سائیکل کے پاس آ کر اس نے تو قیر بھائی سے کہا۔ ”اگر ہوتھی مارکیٹ میں بڑے کتّے نہیں ہیں تو وہ زندہ ہے اور جا کر چھوٹے کتّوں کا سردار بن گیا ہے کیوں کہ اس کا سر بہت بڑا ہے۔ نور دین نے مجھے بتایا تھا۔ ایسے کتّے ریچھ کا شکار کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر۔۔۔۔۔۔ پر بڑے کتے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔“ پھر وہ خود ہی خاموش ہو گیا اور آہستہ سے اچک کر سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔

سڑکیں سنسان ہوتی گئیں اور پھٹپھٹاتی ہوئی سائیکل ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ لارنس روڈ، لالو کھو روڈ، نسرواں سٹریٹ، آدم جی لین، گاڑی کھاتہ اور راماسوامی بہت سے پلے جیکی کی طرح بھونک رہے تھے۔ بہت سوں کا رنگ اس جیسا تھا۔ اکثر اس جیسے نحیف اور کمزور تھے۔ کوئی کوئی شاید بڑے سر والا بھی تھا۔ کسی کی چال ایسی تھی۔ کوئی بھاگتا اسی انداز سے تھا۔ لیکن جیکی کوئی نہیں تھا۔

اسی طرح گھومتے گھومتے بارہ بج گئے۔ لارنس روڈ ویران ہو گئی۔ سینما کے تماشائی گزر گئے۔ سپاہی گھومنے لگے اور کتے اپنی کمین گاہوں دبک کر سو گئے۔

”چلیے اب واپس چلیں۔“ احسان نے پیچھے مڑ کر تو قیر بھائی سے کہا۔ ”بہت رات ہو گئی۔۔۔۔۔ اب جیکی نہیں ملے گا۔ مجھے پتا

ہے یا تو اسے بڑے کتے پھاڑ دیں گے یا وہ خود ٹریمن کے نیچے آ کر کچلا جائے گا۔ ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔۔۔۔ امّی کہتی تھیں۔ پھر پھرا کر خود ہی آ جائے گا لیکن وہ کیوں آئے۔ ہمارے یہاں کون اس سے پیار کرتا تھا۔۔۔۔ جیکی زندہ نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ مر گیا ہے۔ ورنہ اتنی تلاش ضرور اس کا پتہ بتا دیتی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور میری آواز سنتا۔ لیکن وہ زندہ نہیں۔۔۔۔ کوئی گلی کے کتے کو کب پالتا ہے اور کسی کو کیا خبر کہ وہ کتا آوارہ نہیں۔ خان کا اس میں کیا قصور ہے۔ جب اللہ میاں مارنے والا ہو تو ہم خان کو برا کیوں کہیں۔ امّی!۔۔۔ لیکن اس نے اگر قالین پر پیشاب کر دیا تھا تو کیا ہوا۔ میں خود دھو دیتا۔'' پھر اس کے آنسو ڈھلکنے لگے۔'' پر جیکی! وہ زندہ نہیں اگر وہ زندہ ہوتا تو میری آواز سن کر بھاگا آتا۔ آپ کو پہچان لیتا۔ کتے تو بو سونگھ کر میلوں دُور چلے جایا کرتے ہیں۔۔۔۔ یہ دیکھیے، تو قیر بھائی، یہ وہ جگہ ہے جہاں ہماری بڑی ماں ٹریم سے ٹکرا کر مری تھیں۔ وہ یہاں اللہ دین نائی سے پھوڑے پر مرہم لگوانے آئیں تھیں ایک گھنٹے میں ان کی لاش ہمارے گھر پہنچ گئی تھی۔ بڑی ماں نے بھی ٹریم پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مرہم لگوانے ہر روز وکٹوریہ پر جایا کرتی تھیں پر اس دن پتہ نہیں ان کے جی میں کیا آئی کہ ہماری طرح بھاگ کر چڑھنے لگیں۔ پاؤں پھسلا اور گرتے ہی بس ختم ہو گئیں اور جیکی تو کئی گھنٹے سے گم ہے۔ لیکن مجھے پتہ ہے۔ وہ گم نہیں۔ مجھے پتہ ہے وہ گم نہیں۔''

پیر بخاری کے مزار سے گزرتے ہوئے احسان نے کہا۔'' ذرا رو کیے، بھائی جان، ذرا سی دیر کے لیے۔'' اور جب سائیکل رکی تو وہ درگاہ کی چھوٹی سی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا اور اپنی جیب سے کچھ نکال کر اور قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگا۔ دیر تک وہ اسی طرح لب ہلاتا رہا۔ اس کے ریشمی، گھنگریالے بال چورا ہے کی بجلی میں بیچ در بیچ سنہری آرزوں کی طرح جلتے بجھتے معلوم ہوتے تھے۔ پھڑ پھڑاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور تیزی سے ہونکتے ہوئے نتھنے اس کے ضبط کی غمازی کر رہے تھے۔ اور جب وہ دیوار پھاند کر باہر آنے لگا تو بولا۔'' تو قیر بھائی، پیر بخاری کرے اگر وہ زندہ ہے تو آرام سے رہے۔ اسے کوئی صاحب پال لے یا وہ کتوں کا سردار بن جائے۔۔۔ قرآن شریف کی قسم! میں نے پانچ پیسے اس لیے نہیں چڑھائے کہ وہ مجھے واپس مل جائے بلکہ اس لیے چڑھائے ہیں کہ جیکی زندہ رہے اور کوئی اسے تکلیف نہ پہنچائے۔ پیر بخاری سب کی بات پوری کر دیتے ہیں۔ شاید میری۔۔۔۔ میری بھی۔۔۔۔'' پھر اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں پانی جھلملانے لگا۔ باہر سے آنے سے پہلے اس نے اپنی جیب نے پھر ہاتھ ڈالا اور بولا۔'' ایک پیسہ رہ گیا ہے اسے بھی چڑھائے دیتا ہوں شاید جیکی زندہ۔ شاید وہ زندہ رہے۔۔۔۔!''

اور جب وہ باہر آیا تو پھر رونے لگا، اسی شدت سے جب وہ گھر سے نکلتے وقت رویا تھا۔ اس کا سانس پھر ہچکولے لینے لگا اور وہ سسکیاں بھرتا سائیکل پر بیٹھ گیا۔

ایک بج چکا تھا۔ ساری کالونی سو چکی تھی۔ صرف باجی لالٹین سیڑھیوں پر رکھے برآمدے کے ستوں سے لگی بیٹھی تھیں۔ جب وہ دونوں سامنے سے آتے دکھائی دیے تو اس نے اطمنان کا سانس لیا۔ اور لالٹین اٹھا کر اندر چلی گئی۔ برآمدے میں ابا جی، انوار بھائی، خان اور انصار بھائی خراٹے لے رہے تھے۔ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے تو قیر بھائی نے احسان کو دیکھا۔ وہ چادر کندھوں پر ڈالے چارپائی پر بیٹھا تھا۔'' اب سو رہو احسان۔'' انھوں نے کمبل لپیٹ کر کہا۔'' کل پھر کوشش کریں گے۔'' احسان نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ لیٹ

گیا۔

یہ شبِ ماہ نہ تھی۔اس وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔لیکن سمندر کے کنارے گٹھا ٹوپ اندھیرا کبھی نہیں چھاتا۔ستاروں کی روشنی سندر میں منعکس ہو کر تاریکی کو سرمئی بنا دیتی ہے یا وہ اجالا ہی مٹیالا اس سا ہوتا ہے۔

تو قیر سو گیا!

کوارٹر کے باہر بندھی بھینس جگالی کر رہی تھی۔اس کی کٹیا لکڑی کے ڈبے پر تھوتھنی ٹکائے سو رہی تھی۔خان کے خرّاٹوں میں چاقو تیز کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔انوار بھائی سوتے میں انگریزی بولنے لگے اور دیر تک بولتے رہے۔ہوا کی تیزی سے برآمدے کے پردے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ایک عجیب طرح کا بے چین سا سکوت تھا۔ہر ایک کی سانس آواز دے رہی تھیں۔اور ہر ایک چپ چاپ سویا ہوا تھا۔احسان نے دو چار

کروٹیں بدلیں اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جیکی کے متعلق سوچنے لگا۔اس کی پیدائش، پرورش، اس کی طویل بیماری، اس کے معرکے، اس کی سمجھداری، بہادری، جان نثاری، فرض کی ادائیگی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ اس کے ذہن میں کوہ قاف کی پریوں کی طرح تھرکنے لگا۔اسے جیکی کی زندگی کا ایک ایک دن یاد آ رہا تھا۔ایک ایک لمحہ، ایک ایک ثانیہ! اس کے دل اونچے اونچے رونے کو چاہ رہا تھا۔پر سارے سو رہے تھے۔وہ دل میں جیکی کی لمبی عمر اور روشن مستقبل کی دعائیں مانگنے لگا۔ایسی دعائیں جن سے مشیّت کو ذرا بھی دلچسپی نہیں! سوچتے سوچتے اُسے بہت سی ایسی چیزیں یاد آ گئیں جو کعبہ کے قادر نے تلاش کر دی تھیں۔وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند کر وظیفہ کرنے لگا۔

یا کعبے کے قادر!

میرا جیکی کر دے حاضر

ایک گھنٹہ دو گھنٹہ اور پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ یہی وظیفہ کرتا رہا۔گلی میں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ ہوئی اور جیکی بھینس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔احسان چارپائی سے ایک دم اچھلا اور چلایا۔''جیکی''جیکی اس کی زقند سے ہڑبڑا کر بھاگا اور وہ اس کے پیچھے جیکی! جیکی! کے نعرے مارتا دوڑا۔ننگے پاؤں، ننگے سر، وہ جیکی کے پیچھے شور مچاتا بگٹٹ جا رہا تھا۔تو قیر اس کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھا اور اسی طرح برہنہ پا اس کے پیچھے بھاگا۔لیکن احسان اور جیکی کالونی کی حدیں پار کر کے ندی کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔پھر ندی گذر گئی۔گولی مار گاؤں آ گیا، گھنا باغ، عیسائیوں کی قبریں۔وہ جیکی کے پیچھے دیوانہ وار بڑھتا چلا گیا۔پہلے پہل تو قیر کو اس کی آواز سنائی دیتی رہی۔لیکن پھر آہستہ آہستہ جیسے کنوئیں میں ڈوب گئی۔۔۔وہ اپنے اندازے لگا کر پیچھا کرتا رہا۔اُونچی نیچی بھربھری چٹانیں، پیچ کھاتی ہوئی ندی، کوڑے کے ڈھیر، خاردار تھوہر، قبرستان، املی کے درخت، ہڈیوں کا کارخانہ وہ ان کے گرد و نواح میں گھومتا رہا۔جھونپڑیوں کے باہر سوئے ہوئے آدمیوں کو جگا جگا کر پوچھتا رہا مگر بے سود۔حتّٰی کہ اس کے پاؤں زخمی ہو گئے، گلا بیٹھ گیا اور اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔پوپھٹے تو قیر گھر واپس آیا۔سب برآمدے میں جمع تھے۔باجی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔آپی اور منی آپا کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے۔صرف امّی چپ

تھیں۔انوار بھائی سائیکل پر سوار ہو کر کہیں ہو چکے تھے۔خان نے لاٹھی ہاتھ میں لے کر دروازے پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور چل دیا۔اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر احسان نہ ملا تو گھر واپس نہ آئے گا۔ابا جی نے وکٹوریہ میں بیٹھتے ہوئے کوچوان سے کہا۔''مجھے کچھ خبر نہیں۔جہاں تمہارا دل چاہے لے چلو۔''جب وکٹوریہ چل دی تو باجی کے ساتھ آپی اور منی آپا چیخیں مارنے لگیں۔امّی نے انہیں اس طرح سے چلاتے دیکھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئیں۔سامنے کھڑکی کی سلاخ میں زنجیر اسی طرح لٹک رہی تھی۔ایلومینم کا کٹورا فرش پر اُوندھا پڑا تھا۔اور احسان کی چارپائی پر اس کے سرخ کنارے والی چادر کفن کی طرح پڑی تھی۔امّی نے جھٹ سے وہ چادر اچک کر سر پر ڈال لی اور پھر ایکا ایکی برآمدے سے ننگے پاؤں باہر نکل گئیں۔انہیں اس طرح جاتے دیکھ کر چیخیں اچانک تھم گئیں لیکن کسی کو انہیں آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی۔

پیر بخاری کے سبز غلاف کو بوسہ دے کر امّی نے سو روپیہ وہیں رکھ دیا۔جہاں پہلے چھ پیسے پڑے تھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں!

سنگ دل

خداداد چبوترے پر بیٹھا سٹین گن کے دستے سے کوئلے توڑ توڑ کر انگیٹھی میں ڈال رہا تھا۔ ایک کونے میں نون مرچ رگڑنے کا ڈنڈا کھڑا تھا اور دوسرے میں آٹے کا کنستر پڑا تھا جو انڈین پینل کوڈ کی جلد ڈھکا تھا۔ چھلنی میں سرخ مرچیں، نمک کی ڈلیاں اور ہلدی کی گرہیں پڑی تھیں۔ دسترخواں کا ایک کونہ ان پر تھا اور دوسرا گندھے ہوئے آٹے پر۔ سالن کا ایک حصّہ پک چکا تھا اور باقی دیگچیوں میں پڑا تھا۔ کوئلے توڑتے توڑتے خداداد نے سر اٹھا کر اندر بیٹھی ہوئی بازیافتہ لڑکیوں سے پوچھا۔ ''گوشت بھوننا جانتی ہو؟''

ایک نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ ''اُوں ہوں۔''

دوسری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ٹماٹر، پیاز اور پودینے کا کچومر بنا لوگی؟''

اس دفعہ دونوں خاموش رہیں۔

''تو پھر حقّہ ہی تازہ کر دو۔''

''اچھا!'' وہ دونوں یک زبان ہو کر بولیں اور ایک اُٹھ کر اندر سے حقّہ اور چلم اُٹھا لائیں۔ ایک نے ڈرتے ڈرتے سٹین گن کا میگزین پانی کے لوٹے پر سے اٹھایا اور طاق میں رکھ دیا اور آہستہ آہستہ پانی چھوڑ کر حقّہ تازہ کرنے لگی۔ دوسری نے طاق میں پڑے ہوئے میگزین کو دُور ہی سے دیکھا اور چلم کا چغل سونگھتے ہوئے بولی۔ ''چچا، تمبا کو کہاں ہے؟''

''تمبا کو!'' خداداد نے حیرت سے پوچھا اور پھر ہاں! ہاں! کرتے ہوئے تہمد کے ڈب سے ایک پڑیا نکال کر بولا۔ ''ذرا کم ہی ڈالنا تمبا کو۔۔۔۔۔ یہاں تو گھڑی گھڑی بازار بھی نہیں جا سکتے۔۔۔۔۔ اور دیکھو اچھی طرح دبا دبا کر بھرنا۔۔۔۔۔ پانی کے دو قطرے ٹپکا لوگی تو چلم دیر تک چلے گی۔''

پھر وہ انگیٹھی میں کوئلے چننے لگا اور وہ لڑکی بیٹھ کر تمبا کو کو مسلنے لگی۔ اتنے عرصے کے بعد آج ان کے چہروں پر ذرا بات پیدا ہوئی تھی۔ تمبا کو کی مانوس خوش بو شاید انہیں اس وقت کی یاد دلانے لگی جب ان کا باپ انہیں نمبردار کے لڑکے کی آمد پر حقّہ تازہ کرنے کو کہا کرتا ہوگا۔۔۔۔۔ حقّے کی نے میں پھونکتے ہوئے اور چلم کی کوکھ میں تمبا کو جماتے ہوئے یہ دن یاد کر کے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ دونوں بہنیں تھیں!

میں بیٹھک میں چارپائی پر نیم دراز سرکاری روزنامچہ لکھ رہا تھا۔ پمّی کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھ کر باہر گلی میں نگاہ دوڑائی۔ حیوانات کے شفاخانے کے پاس میں نے جانی پہچانی صورت دیکھی۔

''پتاجی آ رہے ہیں؟'' یہ کہہ کر پمّی جیسے آئی تھی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتاجی آئے۔ انھوں نے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''سب سامان پہنچ گیا؟''

''جی!'' میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر خداداد کو دیکھنے لگا۔

''انھوں نے کوٹھڑی کی کھڑکی میں جھانک کر پوچھا۔''محمد خان کہاں گیا ہے؟''

''ڈاک بنگلہ گیا ہے۔میزی مہسری اور چند ضروری کاغذات لینے۔''

''تو گویا تم سارے کاغذات اپنے ساتھ نہیں لائے۔''

میں نے جھینپ کر کہا۔''جی نہیں۔مجھے ایک الماری کا خیال ہی نہ رہا تھا۔''

''بے پرواہ کہیں کے!''اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہ اندر چلے گئے۔ابا جان کے بعد اگر مجھے کسی سے خوف آتا تھا تو وہ پتا جی تھے۔

جس دن ابا جان سب اسسٹنٹ سرجن لگ کر یہاں آئے تھے اسی دن پتا جی سب انسپکٹر پولیس تعینات ہوئے۔دونوں کی ملاقات ریل گاڑی میں ہوئی اور یہ واقفیت بڑھتے بڑھتے گہری دوستی میں تبدیل ہوئی۔اس کی ایک وجہ تو تھانے اور ہسپتال کا قرب تھا۔پھر دونوں کی سخت گیر طعبیت! دوپہر کو مریضوں سے فارغ ہو کر ابا جان تھانے جا بیٹھتے اور شام کو پتا جی ھمارے کواٹر کے آگے کرسی ڈال کر انتظار کرنے لگتے کہ کب ان ڈور مریضوں کا معائنہ ختم ہو اور ابا جان گولڈ لیف کا ڈبہ لے کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔جب امّی نے نمّی کی بی بی کو آہستہ آہستہ پان کھانے کا عادی کر لیا تو میں اور نمّی چپکے چپکے گھر سے نکل کر تھانے کے پچھواڑے ''دلگن''میں چلے جاتے جہاں بیریوں ،گوندنیوں اور سرس کے درختوں کے درمیان سبزی کے چوکور قطعے تھے۔یہاں بیٹھ کر ہم جانے کتنی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔۔۔۔۔خوروسال شیشم کے گہرے سبز پتّے توڑ کر میں اسے پنپیاں بنا کر دیتا جو اس سے کبھی نہ بجتی تھیں۔مینڈھ پر بیٹھے بیٹھے وہ سفید سفید تیزابی مولیاں اکھاڑ کر اپنی اوڑھنی سے پونچھتی اور چاکلیٹ کی طرح کھانے لگتی جنھیں میں آج تک اس اطمینان سے نہیں کھا سکا۔ایک بار بڑی خوشامدوں کے بعد اس نے مجھے اپنی ادھ کھائی مولی کھانے کی اجازت دی تھی اور میں اسے آہستہ آہستہ چباتا رہا تھا۔جیسے ننھے ننھے بوسوں کے نمکین قتلے ہوں۔

پورے آٹھ سال کے بعد پتا جی کی تبدیلی ہوگئی۔اس دوران میں وہ کئی بار اس کے پاس کے تھانوں میں ریلیونگ ڈیوٹی پر تعینات ہوتے رہے لیکن وہ کنبے کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے تھے مگر آخری مرتبہ ان کے آرڈر لائل پور کے نکلے اور میں اور نمّی چلی گئی۔

ابا جان اور پتا جی کی خط و کتابت باقاعدہ جاری رہی۔میں بھی اُدھر سے آیا ہوا خط میز کے دراز سے نکال کر ضرور پڑھتا لیکن اس میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس سے میری تسکین ہو سکتی۔امی اور بی بی کے تحائف پارسل آتے جاتے تھے لیکن ان میں چٹھیاں نہ ہوتی تھیں۔۔۔۔۔تھوڑے عرصے کے بعد ابا جان بھی تبدیل ہو گئے اور ہم سب جالندھر چلے گئے۔یہاں امّی کو ایک اور ع بی بی مل گئیں جو پان کھانے میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ابا جان کو ایک اور سگرٹ نوش دوست مل گئے۔لیکن میرے لیے مولیاں بدستور تلخ رہیں بلکہ ان کی تلخی میں اضافہ ہو گیا۔قیامِ جالندھر کے دوران میں ایک دفعہ پتا جی آ کر ہم سے ملے لیکن اکیلے۔وہ انسپکٹر ہو گئے اور پھلوار جا رہے تھے۔

اس عرصے میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔جس دن مجھے کمیشن ملا ابا جان اسی دن پینشن لے کر گاؤں چلے گئے۔لڑائی جاری رہی اور ہم دیس بدیس کی سیر کرتے اور ملک ملک کا پانی پیتے دادِ شجاعت دیتے رہے۔پورے چار سال بعد جب اپنے وطن کا پھیرا ہوا تو جنگِ عظیم کی چھوٹی بہن خانہ جنگی ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی ملک تقسیم ہوا اور پنجاب کا ہر علاقہ میدانِ کارزار بن گیا۔۔۔۔۔ایک غیر

معیّن عرصہ کے لیے مجھے مشرقی پنجاب سے مغویہ عورتیں برآمد کرانے کے لیے اسی جگہ ڈسٹرکٹ لیاژان آفیسر بنا کر بھیجا گیا جہاں میں نے اور نمّی نے آٹھ سال اکٹھے بتائے تھے۔اس پیاری زمین سے کچھ اس درجہ اُنس ہو گیا تھا کہ میں نے پورے محافظ دستے کا ساتھ ضروری نہ سمجھا۔صرف دو سپاہی خداداد اور خان محمد ساتھ لیے۔موٹر میں خود چلاتا تھا۔

مکمل دو دن ڈاک بنگلے میں ضائع کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہاں کے انسپکٹر پولیس پتا جی ہیں۔فوراً تھانے پہنچا۔انھوں نے گذشتہ دو دن ڈاک بنگلہ میں گذارنے پر سخت سرزنش کی اور میں ان کے یہاں اٹھ آیا۔مجھے پتا جی کی جابر طبعیت سے بہت ڈر لگتا تھا۔

رپورٹ کو مخصوص سرکاری لفافے میں بند کر کے میں نے خداداد سے کہا۔''پہلے اسے ڈاک گھر لے جاؤ روٹی پھر پکا لینا۔''

اس نے پالک کاٹتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور رونی آواز میں بولا۔''لیکن ابھی ہنڈیا کہاں پکی ہے جناب۔''

میں نے جھلا کر لفافہ میز پر ڈال دیا اور سیٹی بجانے لگا۔مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ہنڈیا ہمیشہ چار حصّوں میں پکایا کرتا ہے۔۔۔۔۔خداداد نے ایک دیگچی میں آلو ابال رکھے تھے۔دوسری میں پالک ابال رہا تھا۔اس کے بعد وہ ان دونوں کو ایک بڑی دیگچی میں ڈال کر ہلانے والا تھا۔مصالحہ بھون کر تیسری دیگچی کا مواد وہ اس میں انڈیلے گا۔لیجیے صاحب سالن تیار ہے۔اس دوران میں اگر سیٹی نہ بجے تو اور کیا ہو!

محمد خان ڈاک بنگلے سے باقی ماندہ کاغذات لے کر گھر آیا تو اس نے بتایا کہ چیف لیاژان آفیسر تین ٹرک لے کر برقندی گئے ہیں اور مجھے وہاں ملنے کو کہا ہے۔ضروری کاغذات کی چھان بین میں مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔جاتے ہوئے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے چلنے کی اطلاع اندر بھیجی۔پتا جی سرخ کنارے والی دھوتی اور سفید ململ کا کلیوں والا کرتہ پہنے باہر آئے اور کہنے لگے۔''سوچ سمجھ کر چلا کرو بھائی۔نہ زیادہ بے باکی اچھی ہے نہ سست روی!''میں ٹرک میں سوار ہونے لگا تو امر نے میری پتلون تھام کر کہا۔''بھا پاجی میرے لیے ٹافیاں لانا۔''یہ پتا جی کا لڑکا تھا۔نمّی سے سات سال چھوٹا۔

چبوترے پر خداداد ہنڈیا کا چوتھا حصّہ ابھی پکا رہا تھا۔

برقندی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔نہایت خوبصورت اور پُر فضا۔جوہڑ کے اردگرد نیم کے چھتناروں میں چڑیوں کے غول دوپہر تک شور مچاتے رہتے ہیں۔اور دن بھر جگالی کرتے جانور درختوں کی چھاؤں میں پانی کے اندر بیٹھے رہتے ہیں اور لوگوں کے چہرے گو بیماری، موت اور تبادلے کی صعوبتوں سے اُترے ہوئے تھے تاہم کبھی کبھی ان میں زندگی کی کوئی شوخی اپنی جھلک دکھا جاتی۔ایسی جگہ مغویہ لڑکیاں برآمد کراتے پھرنا ایک بے کیف سی عبادت تھی۔

پورے تین دنوں کے بعد میں صبح دس بجے گھر لوٹا۔بیٹھک کا دروازہ بند کر کے بوٹوں سمیت چارپائی پر دراز ہو گیا۔دھول کی یورش اور صبح صبح پسینہ کی ہلکی ہلکی نمود نے کچھ بے جا نسا کر دیا تھا۔بڑی ہمت سے اُٹھ کر ہاتھ منہ دھویا تو احساس ہوا کی داڑھی مونڈھے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ابھی سیفٹی ریزر میں بلیڈ لگایا ہی تھا کہ نمّی کی آہٹ نے چونکا دیا۔

''لائیے میں آپ کی شیو بناؤں۔''

''شیو؟ پر یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے۔تم سے۔۔۔''

''مہارت نہ مہارت۔لائیے ریزر دیجیے۔''

اور وہ شیو بنانے لگی۔کبھی اس کی لٹ سر سے پھسل کر ٹھوڑی کے نیچے جھولنے لگتی اور کبھی کندھوں پر پڑا ہوا سفید جارجٹ کا دوپٹہ سرک آتا۔وہ گھڑی گھڑی ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر درست کرتی۔لیکن وہ پھر ڈھلک آتے۔آخر تنگ آ کر اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر ساتھ والی تپائی پر ڈال دیا اور جھولتی ہوئی لٹ کی پروانہ کرتے جلدی جلدی شیو بنانے لگی۔لیکن ٹھوڑی کے خم کے بال ہر بار بے موندے رہ جاتے۔اُس نے برش اُٹھا کر ایک دم بہت سا صابن لگا دیا۔پھر دبا کر ریزر پھیرا تو ٹھوڑی کے گڑھے سے خون کے ایک قطرے نے سر نکالا اور احمریں قمقمے کی طرح لٹک گیا۔اس نے گھبرا کر ریزر میز پر رکھا اور تپائی سے دوپٹہ اُٹھا کر اور گولا سا بنا کر میری ٹھوڑی کے ساتھ دبا دیا۔تھوڑی دیر کے بعد کپڑا ہٹا کر بولی۔''خود ہی لیجیے یہ خوں فشانیاں۔ہم سے ایسا پاپ نہیں ہوتا۔''

جب وہ چلی گئی تو میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ٹھوڑی سے ایک ننھا سا عنابی سوتا پھوٹا اور مقناطیس سے چمٹی ہوئی لوہ چون ایسی داڑھی میں یاقوت کی ایک کرچی سی جگمگانے لگی۔۔۔ٹپ!ٹپ!ٹپ!اور تین یاقوت میز پر پڑے تھے۔

شام کو پتا جی مجھے یہ آرڈر دے کر دورے پر چلے گئے کی میں ان کی غیر موجودگی میں باہر نہ سوؤں۔کمرے کا پنکھا رات بھر چلتا رہے اور کھڑکیاں اور روشندان کھلے رہیں۔سب ٹھیک ہونے پر بھی انھیں میری جان کا خطرہ تھا۔وہ چلے گئے تو امر آ کر منہ بسورنے لگا۔''بھا پا جی آپ میرے لیے''ٹافیاں کیوں نہیں لائے؟''

''تافیاں؟''یار ٹافیاں وہاں کہاں۔برفندی تو ایک گاؤں ہے چھوٹا سا۔''

''تو پھر مجھے پیسے دیجیے۔میں خود لے آؤں گا۔''

''میرے پاس اس وقت کھلے پیسے نہیں۔''میں بٹوا دیکھا۔''پمّی سے لے لو۔''

''وہ نہیں دے گی''۔

''دے گی کیوں نہیں۔تم میرا نام لے کر مانگنا''۔

''وہ جب نہیں دے گی۔''

''تو اسے یہاں بلا لاؤ''

''اچھا!''

پمّی نے آ کر بتایا کہ جب سے بی بی کا انتقال ہو گیا ہے امر بہت ضدی ہو گیا ہے۔پتا جی اس سے بہت لاڈ کرنے لگے ہیں اور یہ بگڑتا جاتا ہے۔سارا دن نانی کو تنگ کرتا ہے۔نوکروں سے جھگڑتا ہے۔گندے لڑکوں سے کھلتا ہے اور حد درجے کا چٹورا بن گیا ہے۔اگر مجھ سے خوف نہ کھاتا ہو تو سکول جانا بھی چھوڑ دے۔''لیکن جب میری سفارش پر وہ پمی سے دو آنے لے کر بھاگ گیا تو میں نے کہا۔''ابا جان کے پاس لے جاؤں؟''

''ابّا جان اب بھی مارتے ہیں کیا۔۔۔اسی طرح؟''

''ہاں ہاں اُسی طرح۔''میں مسکرایا۔''بلکہ اب تو ان کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا ہے۔''

''سچ!''بمّی ایک دم جذباتی ہو گئی۔''ہائے میرا دل ابا جان سے ملنے کر کتنا ترستا ہے۔''

''تو چلو پھر۔''

''یہ سن کر وہ مسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی۔''اُوں ہوں۔''

میں نے کہا۔''بمّی، یاد ہے نا، ابا جان نے ایک دفعہ تمہیں بھی پیٹا تھا۔''

''ہاں ہاں!''اس نے آنکھیں میچ لیں۔''یہاں چھڑی لگی تھی ان کی۔آدھی کمر پر اور آدھی بازو پر۔لیکن ساری شرارت تو تمہاری تھی۔تمھیں نے تو مجھے کیچڑ کے گھر ندے بنانے کی ترغیب دی تھی۔تم بڑے شریر تھے جب؟''

''اور اب؟''

''اب تو خیر اچھے ہو۔سرکاری ملازم ہو۔بی۔اے پاس ہو۔۔۔ہاں سچ تم نے بی۔اے کیسے پاس کر لیا؟''

''جیسے کیا کرتے ہیں۔''

''نقل اڑا کر؟''

''نہیں تو''

''میٹرک کی باتیں فھوڑو۔بی۔اے میں ریاضی نہیں تھی نا۔''

''بمّی ہنس پڑی۔''اگر میٹرک میں ہاؤس ہولڈ اکاؤنٹس نہ ہوتا تو میں کبھی اسے پاس نہ کر سکتی۔بھلا گھر بیٹھے کوئی کیسے بتا سکا ہے کہ ایک نالی جب حوض کو دو گھنٹے میں خالی کر دیتی ہے تو دوسری نالی اسی حوض کو کتنے عرصے میں خالی کر دے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور آہستگی سے کہا۔''میں اب جاتی ہوں نانی اماں ادھر آ جائیں گی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔پرانے خیالات کی مالک ہیں نا۔''

''جیسے تمھاری مرضی۔لیکن شام کو ہم''دلگن''ضرور چلیں گے۔میں تمھیں وہاں ایک چیز دکھاؤں گا۔اور ہم اتنی ساری باتیں کریں گے۔''میں نے ہاتھ کھول کر کہا۔

''اتنی ساری''

جس اچانک پنے سے وہ اٹھی تھی اسی اچانک پن سے بیٹھ کر بولی۔''تمھیں اس شعر کا مطلب آتا ہے؟

جو بات دل میں رہ گئی نشتر بنی حفیظ

جو لب پہ آ گئی رسن و دار ہو گئی

میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔''لیکن تم اس شعر کا مطلب سمجھ کر کیا لو گی؟ اسے ایسے ہی رہنے دو۔شعر سمجھ میں آنے لگیں تو انسان کی

روح بے چین ہو جایا کرتی ہے۔"

وہ بھی کچھ دیر سوچ کر بولی۔"میں نے پتا جی کی الماری سے اکثر شاعروں کی کتابیں نکال نکال کر پڑھی ہیں لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔دل کہتا ہے، خوب ہے۔دماغ کو شکوہ رہتا ہے کی مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔"

میں نے بے تکے پن سے کہا۔"مجھے ڈر ہے کسی دن تم خود شعر نہ کہنے لگو۔"

اس کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔"تمھیں یاد ہے، جب تم "دلگن کے کنوئیں میں اُتر کر میرا دوپٹہ نکالنے گئے تھے اور مجھے بھی ساتھ آنے کو کہا تھا تو میں نے کیا جواب دیا تھا۔۔۔۔میری بالکل وہی حالت ہے۔۔۔۔مجھے زندگی جس قدر عزیز ہے موت سے میں اتنی ہی خائف ہوں۔لیکن کبھی کبھی اپنے آپ میرے منہ سے یہ نکل جاتا ہے۔اے خدا! مجھ سے ایک غزل لکھوا دے چھوٹی بحر کی چھوٹی سی غزل، اس کے بعد چاہے تو مجھے موت ہی دے دے۔"

یہ کہہ کر وہ ھرا اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔"ایف۔اے میں تمھیں شاید معلوم نہ ہو، میں اردو میں اوّل آئی تھی۔پتا جی نے مجھے جرمنی کا چھپا ہوا دیوانِ غالب انعام دیا تھا۔جب سوچتی ہوں تو اکثر روتی ہوں کی ایف۔اے میں فرسٹ آ کر بھی میں دیوانِ غالب سمجھ نہیں سکتی۔

میں نے پمّی کو پہلے اس رنگ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔بچپن میں اسے اردو سے لگاؤ ضرور تھا لیکن صرف قصّے کہانیوں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں تک۔۔۔وہ کیوں اس قدر حزیں تھی؟ غالب کے شعروں کی طرح اداس لیکن میٹھی میٹھی!

شام کو ہم سیر کرنے "دلگن" میں گئے تو امر نے بتایا کہ۔"اب یہ علاقہ مُسلوں سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔مسلے بہت برے ہوتے ہیں۔"اس نے ہوا میں گھونسا گھما کر کہا۔"سب کو مارتے ہیں"

پمّی نے اسے جھڑکا۔"یہ بڑا آوارہ ہو گیا ہے۔اسے ابا جان کے پاس لے جاؤ۔"

امر نے گھبرا کر پوچھا۔"ابّا جان کون؟"

"ہیں ایک۔"پمّی ہنسی۔"ہم سب ان سے پٹ چکے ہیں۔ایک دفعہ تم بھی ان کی مار کھا لو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ایسی بکواس نہیں کرو گے۔"

امر سہم گیا۔"کیا وہ بھی مسلے ہیں؟" ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں پمّی کو کونے والی بیری کے نیچے لے گیا اور اسے بتایا کہ جب ان کی تبدیلی لائل پور ہوئی تھی اور جس شام وہ یہاں سے چلے گئے تھے اسی شام میں نے پمّی کا نام اس بیری پر کھودا تھا۔دیا سلائی جلا کر میں نے وہ تنا اسے دکھایا۔لیکن زخم بھر چکا تھا۔اور اب وہاں نشان بھی نہ تھا۔پمّی کھسیانی ہنسی ہنسی اور اس بیری کی جڑ کھودنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو؟" میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ہنسنے لگی۔"اسی دن میں نے تمھارے نام ایک خط لکھ کر یہاں دبایا تھا۔اسے دیکھ رہی ہوں۔"